رشید احمد (جالندھری)

رسولِ کریم ﷺ کا اسوۂ حسنہ اور ہمارے موجودہ مسائل

حالیہ وقت میں ہماری سوسائٹی قلق و اضطراب کا شکار ہے۔ اجتماعی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو، جس میں انتشار، بدنظمی اور کرپشن کا عمل دخل نہ ہو۔ سوسائٹی کی ایک بڑی تعداد معاشی طور پر انتہائی تنگ دست ہے۔ چنانچہ ایک عام آدمی کے شب و روز اسی فکر میں گزر رہے ہیں کہ اس کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے خرچ کہاں سے آئے گا؟ اور اگر کوئی بیمار پڑ گیا تو اسے علاج معالجہ کی سہولت کیوں کر میسر آئے گی؟ اگر کسی سے قرض مل بھی گیا تو اس بات کی کیا ضمانت کہ صحیح دوا وقت پر مل سکے گی۔ غرضیکہ ہماری سوسائٹی کی ایک بڑی تعداد کے لیے زندگی ایک بوجھ بن گئی ہے۔ جہاں تک کھاتے پیتے لوگوں اور خوش حال گھرانوں کا تعلق ہے، انہیں یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ کہیں ان کا کوئی عزیز چوری، ڈکیتی یا فرقہ وارانہ فسادات کا شکار نہ ہو جائے اور جنہیں خدا نے فکر و نظر اور قومی درد سے نوازا ہے، ان کا کہنا ہے کہ ''بے دست و پا کو دیدۂ بینا نہ چاہیے۔'' قرآن مجید نے اس سنگین صورتِ حال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''(آج) لوگوں کی اپنی کرتوتوں سے بر و بحر میں فساد کی آگ بھڑک اُٹھی ہے۔'' (الروم: ۴۱)

ذہنی کرب و الم سے نجات پانے کے لیے زندگی کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتی ہے۔ بعض لوگ دنیا کے بڑے بڑے پیغمبروں، فلسفیوں اور عارفوں کی زندگیوں میں اپنی بے چینی کی دوا پاتے ہیں۔ بعض خوش بخت سکونِ قلب کی تلاش میں سماجی خدمت اور انسانیت کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں اور ادبی ذوق رکھنے والے اپنے حزن و یاس کو شعر و ادب میں انڈیل

دیتے ہیں اور فصلِ گل کو بھی موت کا پیغام جانتے ہیں۔ فانی بدایونی نے کہا تھا:

فصلِ گل آئی یا اجل آئی!
کیوں درِ زنداں کھلتا ہے؟

اہلِ نظر کی ایک بڑی تعداد اخلاص سے یہ رائے رکھتی ہے کہ ہمیں سیاسی اور مذہبی مظاہروں اور ہنگاموں سے ہٹ کر سنجیدگی سے محسنِ انسانیت آنحضرت ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کرنا چاہیے، اس سے ہمیں اپنی انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ اجتماعی مسائل کے حل کرنے میں بھی مدد ملے گی۔

''دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمہی تو ہو''

آنحضرت ﷺ کی سیرتِ طیبہ پر لکھنے سے قبل نہایت ہی اختصار سے عرب سوسائٹی کی اجتماعی زندگی پر لکھنا بے جا نہ ہوگا۔ عرب سوسائٹی مجموعی طور پر ایک بت پرست سوسائٹی تھی، جس میں خدا پرستی اور توحید کا تصور یک قلم اجنبی تھا۔ وہ دوسری زندگی کی بھی قائل نہیں تھی۔ اسے اس بات پر تعجب تھا کہ آنحضرت ﷺ بار بار موت کے بعد دوسری زندگی کی خبر دیتے ہیں کہ وہاں ہر آدمی کو دُنیا میں اپنے کیے کا حساب دینا ہوگا۔ عرب سوسائٹی صرف یہ جانتی تھی کہ قبر کے پرے کوئی زندگی نہیں۔ یہ صرف 'وقت' ہی ہے جو ہماری بربادی کا سبب ہے۔ (الجاثیہ: ۲۴) جب مر کر ہماری ہڈیاں تک بکھر جائیں گی، وہ دوبارہ زندگی کا لباس کیوں کر پہنیں گی؟ (الاسراء: ۴۹) ایک معروف عرب شاعر امراؤ القیس کا کہنا ہے کہ کیا ہم ایک اندھی تقدیر کے غلام نہیں؟ ہم خود اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں۔ یہ موت ہے جو میری جوانی اور زندگی کو مٹی میں بدل دیتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اہلِ مکہ کے پاس زندگی کا کوئی صحت مند تصور نہیں تھا۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مکہ کی سوسائٹی میں چند لوگ یقیناً ایسے تھے، جو سچائی کی تلاش میں رہتے۔ وہ نہ تو بت پرستی کرتے اور نہ ہی اپنی بچیوں کو زندہ درگور اور نہ ہی فقر وغربت کے ڈر سے اولاد کو قتل کرتے۔ ان بے قرار روحوں میں ایک زید بن عمر تھے، جو کہتے: ''خدایا! اگر مجھے علم ہوتا کہ تیری پرستش کیسے کروں، جو تجھے پسند ہے، تو میں یقیناً ایسا ہی کرتا۔

لیکن (صد حیف!) میں یہ نہیں جانتا۔''[1] وہ اپنے آپ کو دینِ ابراہیمی کا پیرو گردانتے تھے۔ انہی حق پرستوں میں حضرت خدیجہؓ اور ان کے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل بھی تھے جو آسمانی نوشتوں کے نہ صرف ماہر بلکہ نصرانی بھی ہو گئے تھے۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ عرب سوسائٹی میں جہاں اخلاقی کمزوریاں اور گمراہیاں تھیں، وہاں ان میں بعض خاندانی اور روایتی خوبیاں بھی تھیں، مثلاً بہادری، پاک دامنی، بلندنظری، مہمان نوازی، عزتِ نفس، شاعری اور اپنی زبان سے محبت۔ واقعہ یہ ہے کہ عرب سوسائٹی کی فطری صلاحیتیں اپنی راہ سے بھٹک گئی تھیں۔ رسول کریم ﷺ نے ان صلاحیتوں کے سامنے خدائی راہ کھول دی، تاکہ وہ زندگی میں ایک مثبت کردار ادا کر سکیں۔

مکہ کی تجارت پیشہ سوسائٹی کی قیادت مکہ کے معروف قبیلہ قریش کے پاس تھی، قریش کعبہ کے پاسبان تھے اور ان کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ کعبہ کی تولیت تھی۔ قریش مکہ اشرافیہ کلاس میں شمار ہوتے تھے۔ اس کے پاس کوئی اخلاقی ضابطہ نہیں تھا جو سوسائٹی میں عدل و انصاف کے قیام کا ضامن ہوتا اور مکہ میں بسنے والے تمام انسانوں کے وقار کا تحفظ کرتا۔ چنانچہ مکہ کی غریب آبادی کے لیے ایک باوقار زندگی بسر کرنا دشوار تھا۔ زندگی کی بے سروسامانی میں اضافہ اس وجہ سے بھی ہوتا تھا کہ قبائلی جنگوں کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔ جن کی وجہ سے ہر طرف بربادی کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ اس تلخ حقیقت سے مکہ کے بعض اصحابِ درد آگاہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے مکہ کے ایک بااثر شہری عبداللہ بن جدعان کے گھر میں ایک اجتماع منعقد کیا۔ جس میں آنحضرت ﷺ بھی جب آپ کی عمر صرف بیس سال تھی، شریک ہوئے۔ اس اجتماع میں یہ طے پایا کہ ہم میں سے ہر آدمی مظلوم کی امداد کرے گا اور مکہ میں کسی ظالم کو رہنے نہیں دیا جائے گا۔ چونکہ یہ معاہدہ (حلف الفضول) ایک بلند مقصد کے لیے وجود میں آیا تھا، اس لیے آنحضرت ﷺ عہدِ نبوت میں اس معاہدے کے بارے میں فرمایا کرتے تھے: ''میں عبداللہ بن جدعان کے گھر میں ہونے والے معاہدہ میں موجود تھا۔ میں اس کے مقابلہ میں سرخ اونٹوں (عربوں کا سب سے قیمتی سرمایہ) کو بھی پسند نہیں کرتا۔ اگر (آج بھی خوں ریزی کو روکنے کے لیے) مجھے

اس معاہدہ کے لیے بلایا جائے تو میں یقیناً اسے قبول کروں گا۔''(۲)

الغرض ساتویں صدی عیسوی میں مکی زندگی ایک نازک دور سے گزر رہی تھی۔ ایک طرف زمین و آسمان کے رشتے ٹوٹ چکے تھے، دوسری طرف سوسائٹی کی مغرور اشرافیہ کے ہاتھوں غریبوں اور غلاموں کی زندگی اپنی حرمت کھو بیٹھی تھی۔ ایسے نازک وقت میں تاریخ کے سٹیج پر آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی جلوہ افروز ہوئی۔ اس وقت کے عرب معاشرے کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر آربری نے لکھا ہے: ''ہمیں اس بات سے بہ خوبی آگاہ رہنا چاہیے کہ قرآن ایسے وقت میں نازل ہوا، جب رومی اور یونانی تہذیبیں مکمل طور پر ختم ہو چکی تھیں۔ یہودیت اور نصرانیت شکست خوردہ مذاہب کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ تعلیماتِ قرآن کا شکریہ! کہ ان کی بدولت تاریخ میں عرب پہلی قوم ہے جو تہذیبوں کی حیات وممات کے راز سے پوری طرح آگاہ ہوئی۔ نیا دین جو کسی معنی میں بھی نیا دین نہیں تھا، بلکہ اسی حقیقت کا نیا ظہور تھا جو ہمیشہ سے کائنات میں جلوہ گر رہی ہے اور جسے انسان نے اس لیے گم کر دیا تھا کہ وہ ماضی کی سنگین غلطیوں سے اجتناب کرنے میں ناکام رہا تھا اور اس نے خدائی مشیت کے خلاف بغاوت کی تھی۔''(۳)

آپ نے شروع میں تین سال تک نہایت ہی خاموشی سے اپنے ملنے والوں سے اپنی دعوت کا تذکرہ کیا۔ چنانچہ جن لوگوں نے آغاز میں اس دعوت کو قبول کیا، وہ تقریباً وہی لوگ تھے، جو سوسائٹی کی روش سے خوش نہیں تھے اور حق کی تلاش میں تھے۔ مثلاً آپ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت علیؓ اور دوسرے معزز صحابۂ کرامؓ۔ لیکن ایک وقت کے بعد آپ کو حکم ہوا کہ وہ اپنی دعوت کا کھل کر پرچار کریں۔ (الحجر:۹۴) چنانچہ آپ نے مقامِ صفا پر اہلِ مکہ کو بلایا اور کہا: ''اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر تم پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہے، تو کیا تم میری بات مان لو گے؟'' ''ہاں!' سب نے کہا،'' کیوں کہ ہم آپ کو ایک راست باز انسان کی حیثیت سے جانتے ہیں۔'' یہ سن کر آپ نے فرمایا،''تو سنیئے! میں تمہیں ایک آنے والے سخت عذاب سے متنبہ کر رہا ہوں۔'' یہ کہنا تھا کہ قریش کے مغرور سردار ناراض ہو کر واپس چلے گئے۔ ابولہب بھڑک اُٹھا اور کہا،''... کیا تم نے اسی لیے ہمیں یہاں بلایا

تھا؟"(۴)

آپ نے اپنی دعوت کو جاری رکھا اور بار بار اہلِ مکہ کو یاد دلایا کہ اس کائنات کا خالق خدا ہے، جو سب سے بے نیاز ہے۔ اس تخلیق میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس لیے صرف وہی ذات پرستش کی مستحق ہے۔ لیکن اہلِ مکہ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ اپنی بت پرستی کو خدائی قرب کا ذریعہ قرار دیتے تھے۔ (الزمر:۳)

آپ نے مزید فرمایا کہ یہ زندگی کھیل کود اور متاعِ غرور کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس لیے انسان کو اپنی نفسانی خواہشوں کے فریب میں آنا نہیں چاہیے۔ آپ نے اپنی دعوت میں جہاں خدائے تعالیٰ کے قادرِ مطلق ہونے اور بتانِ وہم وگماں کے توڑنے پر زور دیا، وہاں آپ نے یہ بھی بتایا کہ انسان زمین پر خدا کا نائب ہے اور اسے آزاد ارادے اور علم وعقل کی نعمت سے نوازا گیا ہے۔ چنانچہ انسان کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا ایک فضیلت اور نیکی ہے اور جو لوگ اپنے غریب بھائیوں کی فلاح کے لیے کام نہیں کرتے، وہ دراصل دین کا انکار کر رہے ہیں۔ قرآن مجید میں آیا ہے: "بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو 'دین' کو جھٹلاتا ہے؛ یہ وہی (بدبخت) ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور غریبوں کو کھانا کھلانے کے لیے (لوگوں کو) ترغیب نہیں دیتا۔" (الماعون:۱-۳)

آپ نے اپنی دعوت میں توحید کے بعد معاشرے میں سماجی انصاف کے قیام پر زور دیا۔ آپ نے اس بات کی بار بار تلقین فرمائی۔ اہلِ مکہ نے جب دیکھا کہ ان کی شدید مخالفت بے نتیجہ رہی تو انہوں نے آپ سے ملنے کی خواہش اس شرط پر کی کہ آپ اپنے غریب ساتھیوں کو اپنی صحبت سے دُور رکھیں۔ لیکن آپ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ (الانعام:۵۲، الکہف:۲۸)(۵)

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اہلِ مکہ کی شدید مخاصمت کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپ نے اپنی دعوت میں ان کو یا ان کے بتوں کو برا بھلا کہا تھا۔ اس کے برعکس آپ نے نہایت ہی صبر وتحمل اور حکمت و دانش سے کام لیتے ہوئے ان تک اپنا پیغام

پہنچایا کیوں کہ قرآن کا فرمان یہی ہے۔ ''(اے پیغمبر!) لوگوں کو حکمت اور حسنِ وعظ سے اپنے پروردگار کی طرف بلائیے (اور اختلاف رکھنے والوں سے) حسن وخوبی سے بحث کیجئے اور بے شک تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گیا ہے۔'' (النحل: ۱۲۵) اسی حسنِ بیان سے متعلق کہا گیا ہے کہ ''اہلِ کتاب سے بحث ونزاع نہ کرو۔ لیکن بہترین طریق سے۔'' (عنکبوت: ۴۶)

چنانچہ پیغمبرؐ اسلام نے پیغمبرانہ وقار کے ساتھ اپنی دعوت کو جاری رکھا جو آہستہ آہستہ مکہ اور حجاز کی سنگلاخ سرزمین میں آگے بڑھتی رہی۔ جب حریفوں سے کوئی جواب بن نہ پڑتا تو وہ آپ کو 'ساحر' (جادوگر) کہتے۔ لیکن ان کے اس الزام میں بھی اس بات کا اعتراف تھا کہ پیغمبرؐ اسلام کا اندازِ بیان اس قدر مؤثر اور دل آویز ہے کہ سننے والے وجد میں آجاتے ہیں۔ گویا ان پر جادو کر دیا گیا ہے۔

قرآن مجید نے وعظ وارشاد میں جہاں حکمت ودانش اور حسن وخوبی کی راہ پر چلنے کی تلقین فرمائی، وہاں رسولِ کریمؐ نے اپنی دعوت میں آزادئ رائے کے اظہار کا بھی کھل کر ذکر فرمایا کہ دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں۔ ہر آدمی دین کے بارے میں مکمل طور پر آزاد ہے۔ قرآن مجید نے صاف طور پر اعلان فرمایا: لا اکراہ فی الدین۔ (البقرہ: ۲۵۶) یہ آیت مدنی دور سے تعلق رکھتی ہے۔ جب مسلم جماعت کو اس شدید مخاصمت کا سامنا نہیں تھا جس سے اسے مکی دور میں واسطہ پڑا تھا۔ لیکن مکی دور کے دورِ ابتلاء میں بھی رسولِ کریمؐ نے واضح طور پر اہلِ مکہ سے فرمایا: ''میرا دین میرے ساتھ ہے اور آپ کا دین آپ کے ساتھ۔'' (الکافرون: ۶) لیکن اہلِ مکہ نے اپنی جارحانہ روش کو ترک نہ کیا۔ وہ رسولِ کریمؐ کے اس بنیادی حق کو نہیں مانتے تھے کہ آپ اپنی دعوت کا پرچار کریں۔ آپ نے انہیں یہ بھی فرما دیا تھا کہ ''میں تم پر کوئی داروغہ نہیں ہوں کہ تم سے اپنی دعوت جبراً منواؤں۔'' لست علیھم بمصیطر۔ (الغاشیہ: ۲۲؛ الانعام: ۱۰۷)

حالیہ وقت میں پاکستانی سوسائٹی کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مذہبی بحث ومذاکرہ میں

تشدد اور انتہا پسندی کا عمل دخل بڑھ گیا ہے اور پرامن اختلافِ رائے کی راہ ترک کر دی گئی ہے۔ مثلاً پاکستان کی مسلم جماعت دو بڑے گروہوں پر مشتمل ہے۔ اہل السنۃ اور اہلِ التشیع۔ دونوں گروہ اسلام کی بنیادی تعلیمات — توحید، رسالت اور معاد (حیات بعد الممات) کو مانتے ہیں۔ ان کے اختلاف کی نوعیت سیاسی، کلامی یا فقہی ہے۔ چنانچہ ہر گروہ کو اخلاص سے مذہبی تعلیمات کی تشریح وتعبیر کا حق حاصل ہے اور وہ خوش اسلوبی سے اپنے اختلافِ رائے کا اظہار بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن اختلاف کی جائز حدود سے تجاوز کر کے تشدد، قتال اور انتہا پسندی کی راہ اختیار کرنا مذہب کی مقدس تعلیمات کے خلاف ہے، اور پوری سوسائٹی کے لیے انتہائی مہلک بھی۔ چنانچہ ہمارا دینی اور قومی فرض ہے کہ ہم رسولِ کریمؐ کی سیرت طیبہ کی روشنی میں اپنا محاسبہ کریں کہ ہم کہاں تک رسول کریمؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کر رہے ہیں؟ یہی طرزِ عمل ہمیں دوسرے مذاہب؛ نصرانیت، ہندوازم اور اپنے پڑوسیوں سے، خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو، اختیار کرنا چاہیے۔ یہ وقت، حکمت و دانش، اور آنحضرتؐ کی سیرتِ طیبہ کا تقاضہ ہے۔ اگر ہم اسے پورا کریں گے تو اس میں ہمارا ہی بھلا ہے۔ اگر نہیں کریں گے تو پھر رسوائی ہمارا مقدر ہے، جس سے ہم بچ نہیں سکتے۔ فطرت کسی کی خاطر اپنے قوانین نہیں بدلتی۔

رسولِ کریمؐ نے توحید کے بعد سماجی انصاف کو اپنی دعوت کا بنیادی رکن قرار دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ توحید کے نظریہ میں بنی نوع انسان کی وحدت بھی مضمر ہے، جس کا ذکر قرآن مجید اور آنحضرت ﷺ نے بار بار فرمایا ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے کہ جب آپ کی دعوت اہلِ مکہ کی سخت مخالفت کے باوجود آگے بڑھتی گئی تو اہلِ مکہ کی اشرافیہ نے آپ سے ملنے کی خواہش کی۔ لیکن اس شرط پر کہ اس ملاقات میں آپ کے تنگ دست اہلِ ایمان شامل نہ ہوں، لیکن آپ نے اس شرط کو مسترد کر دیا۔ ایک وقت کے بعد عمائدین مکہ پھر ''نیا جال'' لائے اور کہا کہ اگر آپ (ﷺ) اپنی دعوت سے دست بردار ہو جائیں تو آپ مکہ کی کونسل (انتظامیہ) کے ممبر یا صدر بن سکتے ہیں۔ اگر مال و دولت کی ضرورت ہے، تو وہ بھی ہم فراہم کر سکتے ہیں۔ اس پیشکش کے جواب میں آپؐ نے فرمایا: ''میں جس پیغام کو لے کر آیا ہوں، اس کا مقصد نہ تو

تمہاری سیادت و قیادت ہے اور نہ ہی تمہاری دولت۔ چنانچہ میں نے تمہیں اپنے پروردگار کا پیغام سنا دیا ہے... خدا میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کر دے گا۔''(۶)

اہلِ مکہ سماجی انصاف کی پیغمبرانہ دعوت کو اپنے سماجی مقام (Social Status) کے لیے خطرہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کا حکم بھی بار بار آیا ہے۔ نماز جہاں انسان کو اس کی معنوی بیماریوں — نفرت، حسد، لالچ — سے نجات دلاتی ہے اور اس کی بے قرار روح کو قرار بخشتی ہے (الرعد: ۲۸)، وہاں زکوٰۃ سوسائٹی کے نادار طبقہ کے لیے ایک باوقار زندگی کی ضمانت دیتی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے انسانی خدمت کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''پوری مخلوق خدائی کنبہ ہے اور جو اس کنبے کے ساتھ جس قدر بہتر حسنِ سلوک کرتا ہے، وہ اسی قدر خدا کی نگاہ میں عزیز تر ہے۔''(۷) ایسے ہی آپ نے بنی نوع انسان کی وحدت کے بارے میں فرمایا: ''خدایا! گواہ رہنا، سب بندے بھائی بھائی ہیں۔''(۸) آنحضرت ﷺ نے صحیح مسلم کی ایک حدیثِ قدسی میں فرمایا ''خدا قیامت کے روز آدمی سے پوچھے گا کہ میں بیمار ہو گیا، تم نے میری بیمار پرسی نہیں کی۔ بندہ تعجب سے کہے گا، بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے تُو تو رب العالمین ہے؟ خدا فرمائے گا کہ کیا تجھے معلوم نہیں، میرا فلاں بندہ تیرے پڑوس میں بیمار ہو گیا تھا اور تم نے اس کی خبر نہیں لی تھی اگر تو اس کی بیمار پرسی کے لیے جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اسی طرح خدا فرمائے گا کہ اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا، مگر تم نے نہیں دیا۔ بندہ عرض کرے گا کہ بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے کسی بات کی احتیاج ہو؟ خدا فرمائے گا کہ کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے انکار کر دیا تھا، اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا...'' الغرض قرآن اور اسلامی روایات نے واضح طور پر کہا ہے کہ ''جو خدا سے محبت کرنا چاہتا ہے، اسے چاہیے کہ اس کے بندوں سے محبت کرے۔''(۹) رابندر ناتھ ٹیگور نے کیا خوب لکھا ہے کہ جب مہاتما بدھ خدا کی تلاش میں شاہی محل میں سوئے ہوئے بیوی بچوں پر آخری نگاہ ڈال کر باہر نکلے تو ہاتفِ غیبی نے آواز دی کہ ''تم میری تلاش میں مجھے

ہی پیچھے چھوڑے جا رہے ہو۔''

چنانچہ مکہ کی زندگی میں خوش حال اہلِ ایمان انفرادی طور پر اپنے غریب بھائیوں کی برابر امداد کرتے تھے۔ لیکن مدنی دور میں جب ایک نئی اخلاقی سوسائٹی کو سیاسی طاقت بھی مل گئی، تو سرکاری سطح پر مستحق افراد کو مالی امداد دی جاتی تھی۔ آپ کی رحلت کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں بعض مسلم قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کے خلاف جنگ کی اور کہا جو آدمی نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا (یعنی نماز تو پڑھتا ہے لیکن زکوٰۃ دینے سے انکار کرتا ہے)، اس کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ زکوٰۃ جن لوگوں میں تقسیم کی جاتی ہے، ان میں ایک گروہ الفقراء کا بھی ہے۔ الفقراء میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں۔[۱۰]

آپؓ کے بعد جب حضرت عمرؓ آئے، تو انہوں نے انسانی فلاح و بہبود کے لیے نئے نئے تجربے کیے، جن کا بنیادی مقصد عدل و انصاف کے اصولوں پر مبنی سماجی اداروں کا قیام تھا۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ عدل و انصاف کے ادارے ان کی تمناؤں کے مطابق ابھی تک وجود میں نہیں آئے تو انہوں نے فرمایا: ''آج مجھے جن باتوں کا پتہ چلا ہے، اگر ان کا علم پہلے ہو جاتا تو میں مال دار لوگوں کے زائد سرمایہ کو چھین لیتا اور غریبوں میں تقسیم کر دیتا۔''[۱۱] دوسرے متعدد واقعات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ معیارِ زندگی یا تمدن و کلچر کے ارتقا کے ایک خاص حد تک آگے جانے کے قائل تھے۔ لیکن اگر معیارِ زندگی کی بلندی میں عیش و عشرت اور تن آسانی داخل ہو جائے تو یہ زندگی ان کی نظر میں زندگی نہیں تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے ریاست میں بعض لوگوں کو دو منزلہ یا سہ منزلہ مکان بناتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے اسے ناپسند کیا۔[۱۲] ایسے ہی انہوں نے ہفتے میں ایک یا دو دن گوشت کھانے پر بھی پابندی لگا دی تھی۔ جب انہوں نے مدائن (ایران) کی فتح کے بعد اس علاقے کی دولت اور مسلم فوجوں کے مسائل کو دیکھا تو کہا ''کاش! ایران اور ہمارے درمیان آگ کا سمندر حائل ہوتا۔''

غرضیکہ ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمرؓ اس سوچ و بچار میں رہتے کہ

انسانی ارادے کے عزم و ولولہ اور سخت کوشی کی زندگی کو عیش و عشرت کے فطری نتائج یعنی زوال و انحطاط سے کیسے بچایا جائے؟ چنانچہ وہ معاشرے کے ہر فرد کی بنیادی معاشی ضروریات کو تو پورا کرنے کے لیے برابر قدم اُٹھاتے رہے، لیکن تن آسانی کے جلو میں آنے والے فتنوں سے بھی آگاہ کرتے رہے۔ ان کے معاشی اقدامات کو ایک معروف مصری اہلِ علم محمد حسین ھیکل اپنی کتاب ''الفاروق عمرؓ'' میں سوشلسٹ معیشت کا نام دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ حضرت عمرؓ جس فاضل دولت کو بحق فقرا ضبط کرنا چاہتے تھے، وہ جائز وسائل سے کمائی گئی تھی۔ ایسے ہی زکوٰۃ کی شرح میں جو ابوالکلام آزاد کی رائے میں انکم ٹیکس ہے، اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے، تاکہ ایک فلاحی معاشرہ وجود میں آئے، جیسا کہ برطانیہ میں وجود میں آیا۔ اب سوال یہ ہے کہ موجودہ وقت میں جب ہماری بیمار معیشت نے نادار طبقہ کی زندگی کو شرمندگی میں بدل دیا ہے، ہم عملی طور پر سیرتِ نبویؐ سے استفادہ کیوں کر کریں؟

اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ سوسائٹی کا متمول طبقہ ایک مربوط پروگرام کے تحت سماجی خدمت کے لیے ہسپتال اور تعلیمی ادارے کھولے، جیسا کہ بعض حضرات نے کھول بھی رکھے ہیں۔ لیکن ان مسائل سے مؤثر طور پر عہدہ برآ ہونے کے لیے حکومت ہی ٹھوس منصوبہ بندی کر سکتی ہے۔ اس سلسلے میں نہ صرف زمینداری سسٹم کو ختم کیا جائے، جس کی برطانوی راج نے سرپرستی کی اور لاکھوں کاشت کاروں کو غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا[۱۳] بلکہ بعض ترقی یافتہ فلاحی معاشروں— برطانیہ، سویڈن، ناروے— کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ کام وہی حکومت یا سیاسی جماعت کر سکتی ہے جو زندگی کے بلند نصب العین سے سرشار ہو اور بندۂ مزدور کے تلخ اوقات سے آگاہ۔ افسوس! اس نصف صدی میں ہم نے جاگیردارانہ سیاست کو ختم کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ البتہ ۱۹۷۷ء کی فوجی حکومت نے نظامِ زکوٰۃ کا تعارف کرایا۔ لیکن وہ ایک مؤثر ادارے کی شکل اختیار نہ کر سکا۔ اگر اس کی انتظامیہ مخلص، اہل اور محنتی افراد پر مشتمل ہوتی اور سیاست اس پر شب خون نہ مارتی تو یہ ادارہ غریب طبقہ کی بہتر خدمت کر سکتا تھا۔ آج ہماری سوسائٹی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ نادار طبقے کو

باوقار طور پر زندہ رہنے کا حق کیوں کر دیا جائے؟ پیشہ ور اشرافیہ یا سیاسی مافیا کی حرص و آز پر قابو کیوں کر پایا جائے؟ یہ کام جاگیردارانہ معیشت اور سرمایہ دارانہ سیاست کو دفن کیے بغیر نہیں ہو سکتا۔

قریشِ مکہ نے اپنے سماجی مقام کے تحفظ کے لیے رسولِ کریم ﷺ کی دعوت کو ہر طریق سے ناکام بنانے کی کوشش کی۔ وہ رسول کریم ﷺ کے شفیق سرپرست چچا حضرت ابوطالب کے پاس آئے اور کہا کہ آپ اپنے بھتیجے کو اپنی دعوت سے روکیے بلکہ آپ ان کو ہمارے حوالے کر دیں۔ حضرت ابوطالب نے قریش مکہ کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر آنحضرت ﷺ سے کہا: ''میرے عزیز بھتیجے! مجھ پر اتنا ہی بوجھ ڈالیے جتنا میں برداشت کر سکوں۔'' یہ سن کر آپ کی آواز بھر آئی اور فرمایا: ''اگر یہ لوگ (قریشِ مکہ) میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تو بھی میں اپنی دعوت سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں۔'' یہ کہا، آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے (He burst into tears.) اور چل دیئے۔ حضرت ابوطالب نے کہا: ''میرے بھائی کے بیٹے واپس آیئے۔'' آپ واپس ہوئے تو شفیق چچا نے کہا: ''آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، کہیے۔ بہ خدا! میں آپ کی حمایت و نصرت سے کبھی دست بردار نہیں ہوں گا۔''(۱۴)

تاریخ نے ہمیں بتایا ہے کہ حق کی آواز دنیا میں ایک ہی انداز سے بلند ہوتی رہی ہے۔ رسولِ کریم ﷺ نے ساتویں صدی عیسوی میں منکرین حق کے سامنے جو آواز بلند کی تھی وہی آواز صدیوں پہلے سقراط نے یونان کی عدالت میں بلند کی تھی۔

سقراط نے ایتھنز کی عدالت کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: ''تمہیں علم ہونا چاہیے کہ (حکمت اور سچائی کی تبلیغ) خدائی امر ہے۔ اور میرا اعتقاد ہے کہ خدا کے لیے میری بندگی سے بڑھ کر اہلِ ایتھنز کے لیے شاید ہی کوئی بڑی اچھائی ہوگی... میں اس کے سوا کچھ نہیں کہتا کہ میں تمہیں— جوان ہوں یا بوڑھے— یہ سمجھانے کی سعی کرتا ہوں کہ تمہاری پہلی اور بنیادی کوشش اپنے روحانی کمال کو حاصل کرنا ہے۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ نیکی کو دولت سے خریدا نہیں جاتا۔

اگر یہ نظریہ نوجوانوں کو خراب (Corrupt) کر رہا ہے تو پھر میں واقعی ایک 'برا آدمی' ہوں۔ اے اہلِ ایتھنز! میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ تم مجھے بَری کرو یا نہ کرو، میں ہرگز اپنی راہوں کو بدلنے والا نہیں ہوں۔ خواہ مجھے ایک بار نہیں (سو بار) بھی مرنا پڑے، میں نے اپنی اس دعوت سے کوئی مالی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کی سچائی پر سب سے بڑی دلیل میری غربت ہے... (دوستو! ایک دوسرے سے) جدا ہونے کی گھڑی آ پہنچی۔ ہمیں اپنی اپنی راہ پر چلنا ہوگا۔ مجھے موت کی راہ پر اور تمہیں زندگی کی راہ پر۔ کونسی راہ بہتر ہے؟ اسے صرف خدا ہی جانتا ہے۔''(۱۵)

تاریخ نے صدیوں بعد حق و باطل کی اسی کشمکش کو مکہ میں پھر دیکھا، جب پیغمبرؐ اسلام نے پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ اعلان کیا: ''میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند بھی رکھ دو تب بھی میں اپنی راہوں کو چھوڑنے والا نہیں۔''

مکہ میں دعوت کا یہ سلسلہ تیرہ برس جاری رہا۔ پھر ایک وقت آیا کہ جب مکہ میں آپ کا غم خوار اور شفیق چچا ابو طالب اور آپ کی زوجہ محترمہ، جنہوں نے ہر مشکل وقت میں آپ کا ساتھ دیا تھا، دونوں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آنحضرتؐ نے اس سال کو ''عام الحزن'' قرار دیا۔

طائف کا سفر:

ان دو عظیم شخصیتوں کی رحلت کے بعد رسولِ کریم ﷺ کے خلاف اہلِ مکہ کی جارحانہ روش کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اب آپ مکہ کے جنوب مشرق میں طائف نامی شہر میں تشریف لے گئے۔ افسوس! طائف کے سرداروں نے آپ کی دعوت کو نہ صرف سننا گوارا نہیں کیا، بلکہ اپنے نوکروں اور اوباشوں کو بھی آپ کے خلاف اُکسایا جو آپ پر پتھر پھینکتے رہے اور رقصِ ابلیس کرتے ہوئے آوازے کستے رہے۔ آپ کے پاؤں زخمی ہو گئے، خون بہنے لگا۔ وہ آپ کو جس حد تک ستا سکتے تھے، ستایا۔ آپ کے ساتھی حضرت زید بن حارثہؓ نے ہر ممکن طریق سے آپ کا دفاع کیا۔ دونوں نے انگور کے درخت کے نیچے پناہ لی جو عُتبہ اور شیبہ کے باغ سے ملحق تھا، دونوں آپ کے دشمن تھے، اس لیے آپ نے ان کے باغ میں جانا پسند نہیں فرمایا۔ آپ

نے خدا سے دُعا مانگتے ہوئے کہا: ''خدایا! میں اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں میں اپنی بے توقیری کا شکوہ تجھی سے کرتا ہوں، اے ارحم الراحمین! تو مظلوموں کا پروردگار ہے، تو میرا پروردگار ہے، تو میری تقدیر کس اجنبی کے حوالے کر رہا ہے جو میری عزت نہیں کرتا یا کس دشمن کو میرے امور کا مالک بنا رہا ہے؟ اگر آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں تو پھر میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔''

جب عُتبہ اور شیبہ نے آپ کو دیکھا تو ان کا دل بھر آیا اور اپنے نصرانی نوکر عداس کے ہاتھوں آپ کی خدمت میں انگوروں کا ایک خوشہ نذر کیا۔ جب آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر انگوروں کو تناول فرمایا تو نوکر نے کہا کہ یہاں کے لوگ تو 'بسم اللہ' نہیں پڑھتے۔ آپ نے فرمایا، کس شہر سے ہو اور کس دین سے تعلق ہے؟ ''میں نینویٰ کا نصرانی ہوں''، عداس نے کہا۔ ''اچھا تو آپ یونس بن متی کی بستی سے ہیں؟ جو پرہیزگار آدمی (رجل صالح) تھے۔'' آپ نے فرمایا۔ ''آپ یونس سے کیسے واقف ہیں'' تو آپ نے جواب میں قرآن مجید کی آیات کریمہ سنائیں۔ عداس یہ سن کر آپ کے ہاتھ پاؤں چومنے لگے اور مسلمان ہو گئے!! آبِ حیات کے کنارے پر بیٹھنے والے عُتبہ اور شیبہ محروم! اور نینویٰ کا ایک بے نوا اجنبی سیراب۔ اقبال نے سچ کہا ہے:

تو جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب
راہ رو دشت ہو سیلی زدۂ موجِ سراب

مکہ اور طائف کی معاندانہ سرگرمیوں سے پتہ چل گیا کہ اب منکرینِ حق ہر قیمت پر اسلام کی دعوت کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اسی اثنا میں مدینہ کے بعض لوگوں نے اسلام کو قبول کر لیا اور مکہ کے بعض مسلمان بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ یہاں مکہ میں منکرینِ حق آپ کو شہید کرنے کی سازشوں میں مصروف تھے۔ لیکن آنحضرت ﷺ خاموشی سے اپنے جاں نثار ساتھی حضرت ابوبکر کی معیت میں مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گئے۔ جہاں پر انصارِ مدینہ آپ کی راہ تک رہے تھے۔ وہاں پہنچ کر مکی مسلمانوں کے اخلاقی جوہر کھلے۔ جب اجتماعی نظم ونسق مسلمانوں کے ہاتھ

آیا، جسے انہوں نے رسول اللہ کی رہنمائی میں بڑی کامیابی سے چلایا۔ ہم یہاں مدنی دور کے صرف دو واقعات کا ذکر کریں گے۔

۱۔ صلح حدیبیہ:

سنہ ۶ ہجری میں رسول کریم ﷺ صحابۂ کرام کی ایک جماعت کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے لیے مدینہ سے مکہ روانہ ہوئے، ابھی آپ مکہ سے چند میل کے فاصلہ پر حدیبیہ نامی ایک مقام پر پہنچے تھے کہ اہلِ مکہ نے فیصلہ کیا کہ وہ آنحضرت ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو مکہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔ خواہ اس کے لیے میدانِ کارزار ہی کیوں نہ گرم کرنا پڑے۔ آنحضرت ﷺ نے اس جنگ کو روکنے کے لیے مذاکرات کیے۔ چنانچہ جب مذاکرات کے بعد معاہدہ لکھنے کا وقت آیا تو آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ لکھئے: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اہلِ مکہ کے نمائندے سہیل نے اعتراض کیا کہ عربوں کے رواج کے مطابق 'باسمک اللھم' لکھیے۔ آپ نے اس سے اتفاق کیا۔ (۲) آپ نے فرمایا کہ یہ معاہدہ اللہ کے رسول محمد اور اہلِ مکہ کے درمیان ہے۔ اس پر بھی مکی نمائندہ نے اعتراض کیا کہ اگر ہم آپ کو پیغمبر مان لیتے ہیں تو پھر جھگڑا کس بات کا ہے! چنانچہ طے ہوا کہ لفظ رسولِ خدا کی بجائے آپ کے اسمِ گرامی کے ساتھ آپ کے مرحوم والد کا نام لکھا جائے۔

اس معاہدے کی ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر مکہ کا کوئی آدمی (مسلمان) مدینہ آ جائے تو اسے واپس مکہ بھیج دیا جائے۔ لیکن اگر مدینہ سے کوئی آدمی مکہ آ جائے تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا۔ یہ بات بھی مان لی گئی کہ مسلمان اس سال نہیں بلکہ آئندہ سال تین دن کے لیے مکہ میں آ سکتے ہیں۔ اس معاہدے سے بعض مسلمان آزردہ تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس معاہدہ سے مسلمانوں کی سبکی ہوئی ہے۔ لیکن قرآن مجید نے اس معاہدے کو فتح قرار دیا۔ (سورۃ الفتح) کیونکہ امن نے جنگ پر فتح پائی تھی۔ نیز اہلِ مکہ جو آج تک آنحضرت ﷺ کی شخصیت کو نہیں مانتے تھے، اس معاہدہ میں آپ کو ایک پارٹی کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔

اس معاہدہ کو طے کرتے وقت آنحضرت ﷺ نے اہلِ مکہ کے اشتعال انگیز موقف

کے مقابلہ میں جس صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا، اس نے بتا دیا کہ آج مذاکرات کو کامیاب بنانے کے لیے پیغمبرانہ راہ پر چلنا کس قدر ضروری ہے۔ اس معاہدے پر تبصرہ کرتے ہوئے اپسلا یونیورسٹی کے پروفیسر تور اندرے (Tor Andrae) نے لکھا: ''ضبطِ نفس جس کا مظاہرہ محمد (ﷺ) نے حدیبیہ میں فرمایا اور ایک بلند مقصد کے حصول کے لیے معمولی باتوں پر توہین کو برداشت کرنے کی اہلیت، ان دونوں باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی شخصیت ایک منفرد اہلیت کی مالک تھی۔ آپ کی سی فکری برتری رکھنے والا انسان ہمیشہ اپنی باگوں کو اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے، حتیٰ کہ ایسے وقت میں بھی جب اسے ایک لمحہ کے لیے جھکنے پر مجبور کر دیا جائے۔ آخر وہ وقت جلد ہی آ گیا جب انہوں نے اپنی حکمت و دانش کا پھل جس کا مظاہرہ انہوں نے حدیبیہ میں کیا تھا، حاصل کر لیا۔''(۱۶)

ہمیں انتہائی دکھ سے لکھنا پڑتا ہے کہ برصغیر اور جنوبی ایشیاء کے دو بڑے ملک (بھارت اور پاکستان) اپنے سیاسی اختلافات کو ابھی تک پرامن مذاکرات کے ذریعہ حل نہیں کر پائے جس سے دونوں ملکوں کے کروڑوں غریب عوام متاثر ہو رہے ہیں۔ دونوں ملک بنیادی طور پر امن اور شانتی کو ایک بلند قدر مانتے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے اختلافات کا کوئی حل تلاش کرنے میں ناکام رہے۔ ہماری روحانی قدروں اور حکمت و دانش کا تقاضہ ہے کہ یہ مذاکرات برابر جاری رہنے چاہئیں اور باہمی تلخیوں، نفرتوں اور ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم کو ختم کرنا ہوگا۔ یہ تین دھارے کا انوکھا خنجر لوہے کی دو دھاری تلوار سے زیادہ خطرناک ہے۔ ہمارے پیغمبر اعظم (ﷺ) نے ہمیں یہی درس دیا ہے کہ بلند مقاصد کے لیے وسائل بھی بلند ہونے چاہئیں۔ اسی طرح مہاتما بدھ، اشوک، مُعین الدین چشتی اور گاندھی جی نے بھی اہلِ ہند کے لیے یہی بلند روایات چھوڑی ہیں۔

۲۔ فتح مکہ:

حدیبیہ معاہدہ دس سال کے لیے تھا۔ اس معاہدے میں عربوں کے دو قبیلے: خزاعہ مسلمانوں کے حلیف تھے اور بنوبکر قریش کے۔ ان دونوں (بنوخزاعہ اور بنوبکر) قبیلوں میں باہمی

عداوت تھی۔ چنانچہ بنوبکر نے موقعہ پاتے ہی بنوخزاعہ کے آدمیوں کو حرم کی حدود میں قتل کر دیا۔ خزاعہ کے خلاف بنوبکر کی جارحانہ کاروائیوں میں قریش نے بنوبکر کا ساتھ دیا۔ ان کا یہ قدم معاہدۂ حدیبیہ کے خلاف تھا۔ چنانچہ خزاعہ کے آدمی مدینہ میں آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے خلاف قریش اور بنوبکر کے خونی واقعات کو آنحضرت ﷺ کے علم میں لائے۔ جس سے آپ کو دکھ ہوا۔ آنحضرتؐ نے قریش کو پیغام بھیجا کہ وہ مندرجہ ذیل تین میں سے کسی ایک بات کو مان لیں:

(۱) خزاعہ کے مقتول آدمیوں کا خون بہا دیا جائے۔

(۲) قریش بنوبکر کی امداد بند کر دیں۔

(۳) حدیبیہ معاہدے کو توڑنے کا اعلان کر دیا جائے۔

چنانچہ قریش کے نمائندے نے تیسری شرط کو منظور کر لیا یعنی معاہدۂ حدیبیہ کو توڑنے کا اعلان کر دیا۔ ہرچند بعد میں قریش اپنے کیے پر نادم تھے، لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ابوسفیان قریش کی طرف سے مکہ سے مدینہ پہنچا تاکہ معاہدۂ حدیبیہ کی تجدید ہو سکے، لیکن بات نہ بنی۔

آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے لیے اپنی تیاریاں مکمل کر لیں اور رمضان سنہ ۸ھ میں دس ہزار فوج کے ساتھ مکہ روانہ ہوئے اور مکہ کے قریب مرّ الظہران نامی مقام پر پہنچ کر اعلان کر دیا کہ جو آدمی ہتھیار ڈال دے گا یا ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا یا اپنے گھر میں رہے گا یا خانۂ کعبہ میں داخل ہو جائے گا، اس سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ مسلمان حضرت خالد بن ولید کی کمان میں مکہ کے بالائی حصے سے اور آنحضرت ﷺ زیریں حصے سے مکہ میں داخل ہوئے۔[۱۷] قریش کے ایک گروہ نے راہ روکنے کی ناکام کوشش کی۔

فتحِ مکہ کے دن جب اہلِ مکہ ایک شکست خوردہ گروہ کی حیثیت سے آپ کے سامنے آئے تو آپ نے فرمایا، ''بتاؤ آج میں تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں؟'' ''بہتر (خیراً) آپ ایک شریف بھائی ہیں اور ایک شریف بھائی کے بیٹے۔'' قریش نے کہا۔

''آج کے دن (میری جانب سے) تم پر کوئی سرزنش نہیں، (جو ہونا تھا، وہ ہو چکا) جاؤ! تم سب لوگ آزاد ہو۔'' آپ نے جواب میں فرمایا۔ آپ خانۂ کعبہ میں داخل ہوئے اور وہاں تین سو ساٹھ بتوں کو ٹوکے دیتے جاتے اور پڑھتے: ''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔ باطل مٹنے ہی کی چیز ہے۔'' فتح مکہ میں اپنے سابق دشمنوں کے ساتھ آپ کے حسنِ سلوک پر خود دشمن بھی حیران رہ گئے۔ ابوجہل جیسے سرکش اور منکرِ حق وصداقت کا بیٹا عکرمہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرطِ مسرت سے اُٹھ کر اسے خوش آمدید کہا۔ ابن ابی الحدید نے اپنی شرح نہج البلاغہ میں لکھا ہے: ''آپ (ﷺ) نے عکرمہ کے علاوہ، خواہ وہ معزز ہو یا غیر معزز، کسی آدمی کو کھڑے ہو کر خوش آمدید نہیں کہا۔ عکرمہ آپ کا سخت مخالف تھا۔ لیکن اسلام لانے کے بعد اسلام کے لیے بڑا کام کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جہاد کے لیے امداد کی پیشکش کی۔ لیکن عکرمہ نے اسے قبول نہیں کیا اور کہا بہ خدا! میں جہاد کے لیے کوئی معاوضہ یا کوئی امداد نہیں لوں گا۔ اجنادین کے معرکہ میں رسولِ کریمؐ نے ان سے فرمایا: آج تم مجھ سے جو مانگو گے، میں دوں گا۔'' عکرمہ نے جواب میں کہا: ''میں آپ سے اپنے لیے مغفرت کی التجا کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں مانگتا۔'' حالانکہ عکرمہ کے علاوہ قریش کے سردار مثلاً سہیل بن عمرو، صفوان بن امیہ اور دوسروں نے رسولِ کریمؐ سے مال و دولت کا سوال کیا۔ (۱۸)

فتح مکہ کے دن آنحضرت ﷺ نے اہلِ مکہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں... ہاں آج تمام مفاخر، خون، تمام خون بہا سب میرے قدموں کے نیچے ہیں... اے قریش! خدا نے جاہلیت کے غرور اور باپ دادا کے نام پر فخر کے (سارے دعوؤں) کو مٹا دیا ہے۔ تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔''

خانۂ کعبہ میں حضرت مریمؑ کی تصویر:

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ آنحضرت ﷺ جب خانۂ کعبہ کے اندر داخل ہوئے اور بتوں کو سرنگوں کیا تو وہاں ایک دیوار پر چند تصویریں تھیں، آپ نے شیبہ سے فرمایا: ''ہر تصویر کو مٹا دو، سوائے ان کے جو میرے ہاتھ کے نیچے ہیں۔'' جب آپ نے ہاتھ اُٹھایا تو

وہاں حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہ کی تصویریں تھیں۔ ازرقی نے اپنی کتاب 'اخبارِ مکہ' میں اس سلسلہ میں کئی روایتیں نقل کی ہیں۔ ابنِ شہاب کے حوالے سے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ کی تصویروں کے سوا تمام تصویروں کو مٹا دو۔''(۱۹)

آپ خانۂ کعبہ کے طرزِ تعمیر سے بھی خوش نہیں تھے۔ آپ اس کی تعمیر نئے سرے سے کرنا چاہتے تھے۔ لیکن آپ نے حضرت عائشہ سے فرمایا: ''اگر تمہاری قوم کا کفر سے تازہ تعلق نہ ہوتا تو میں خانۂ کعبہ کو ڈھا کر (ازسرِنو) حضرت ابراہیمؑ کی بنیادوں پر تعمیر کرتا۔'' لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا کیوں کہ اگر آپ ایسا کرتے تو اس سے نومسلم جو ابھی ابھی کفر کی تاریکی سے باہر آئے تھے، فتنہ و ابتلا کا شکار ہو سکتے تھے۔ یہ روایت صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی متفقہ روایت ہے۔(۲۰) کہا جاتا ہے کہ ایک من علم کے لیے دس من عقل چاہیے۔ تاریخ نے ہمیں بار بار بتایا ہے کہ جو لوگ جوش میں ہوش سے کام نہیں لیتے اور حکمت و دانش کی راہ چھوڑ دیتے ہیں، ان کی سرگرمیاں عموماً فتنہ و فساد کا موجب بن جاتی ہیں، جیسا کہ ہم نے چند سال قبل افغانستان میں دیکھا جب حکمرانوں نے بزعمِ خویش مذہبی ''تعلیمات'' سے سرشار ہو کر ہزاروں سال قدیم مہاتما بدھ کے تاریخی مجسموں کو توڑ پھوڑ کر 'بُت شکنی' کا 'تاج' سر پر رکھا اور پوری دُنیا خاص طور پر جاپان کی صداؤں کو سننے سے انکار کر دیا۔ اگر ہمارے دوستوں نے ازرقی کی کتاب 'اخبارِ مکہ' پڑھی ہوتی جس کا ذکر اوپر ہوا، تو شاید افغانستان کے 'مذہبی حکمران' اپنے 'تاریخی نشانات' کو نیست و نابود کرنے سے بچ جاتے۔

ہمارا اعتقاد ہے کہ ہمیں ہمیشہ اور خاص طور پر جب ہم ژولیدگیٔ فکر کا شکار ہوں، اپنے مرکز کی طرف رجوع کرنا چاہیے، اسی لیے ہم نے یہاں اپنے اجتماعی مسائل کو سیرتِ طیبہ کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کی ہے۔ ہمیں اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اگر آج آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی ہمارے درمیان موجود ہوتی تو آپؐ ہمارے مسائل کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھنے اور نعروں اور پروپیگنڈے کی تاریکیوں میں بھٹکنے والی پاکستانی سوسائٹی کی نجات کے لیے ہمیں کیا کیا ہدایات فرماتے؟

ہم یہاں دو اور باتوں: اخلاقی بحران اور پاکستان میں بڑھتی ہوئی بے ہنگم آبادی پر بھی لکھنا چاہتے ہیں [۲۱] جن سے قومی زندگی، سیاست، معیشت بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ پہلے مسئلے پر (اخلاقی بحران) ہم نے پہلے بھی لکھا تھا کہ آپؐ نے اپنی دعوت کی صداقت پر اپنی اجلی اور بے داغ زندگی کو پیش کیا تھا۔ آپ نے اہلِ مکہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: 'اس دعوت سے پہلے میں تم میں اپنی زندگی کا ایک حصہ بسر کر چکا ہوں۔ تم اس بات پر سوچ بچار کیوں نہیں کرتے؟' (یونس:۱۶) یعنی میری زندگی ایک کھلی ہوئی روشن کتاب ہے۔ اگر میں نے کل تک عام زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا تو پھر آج (عہدِ نبوت میں) میں خدا کے بارے میں کیوں کر غلط بات کر سکتا ہوں۔ عجیب بات یہ ہے کہ آپ کی بے داغ سیرت کی شہادت آپ کے ایک بڑے حریف ابوسفیان نے بھی دی، جب اس سے روم کے بادشاہ ہرقل نے پوچھا کہ کیا تم نے کبھی محمد (ﷺ) پر ان کے اعلانِ نبوت سے پہلے جھوٹ بولنے کی تہمت عاید کی؟ نہیں، ابوسفیان نے جواب میں کہا۔ ''جو آدمی (رسول کریمؐ) لوگوں سے جھوٹ نہیں بولتا۔ وہ خدا کے بارے میں کیوں کر جھوٹ بول سکتا ہے''، ہرقل نے کہا۔ آج کل ہم اختلافِ رائے کی بنا پر اپنے سیاسی حریفوں کے خلاف جو رویہ اپناتے ہیں کیا اسے اخلاقی طور پر درست کہا جا سکتا ہے؟

یہی اخلاقی بلندی تھی، جسے قرآن نے 'خُلُقٍ عَظِیمٍ' (القلم:۴) سے تعبیر کیا اور اسی 'بلند طرزِ زندگی' کی طرف آپ نے اہلِ مکہ کو بلایا۔ چنانچہ قرآن مجید نے آپ کی بنیادی دعوت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ''آپ لوگوں کو حکمت اور کتاب کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کا تزکیۂ نفس کرتے ہیں... (البقرۃ:۱۲۹) نیز لوگوں نے (اپنی پشت پر) ''جو بوجھ لاد رکھا ہے اور گلے میں طوق اور پاؤں میں جو بیڑیاں پہن رکھی ہیں۔ پیغمبرؐ ان سے نجات دلاتا ہے۔'' یہ 'بوجھ' کیا تھا اور یہ ''پھندے'' کون سے تھے، جن سے قرآن نے نجات دلائی؟ قرآن نے دوسرے مقامات پر اسے واضح کر دیا ہے۔ مذہبی احکام کی بے جا سختیاں، مذہبی زندگی کی ناقابلِ عمل پابندیاں، ناقابلِ فہم عقیدوں کا بوجھ، وہم پرستیوں کا انبار، عالموں، فقیہوں کی تقلید کی بیڑیاں، پیشواؤں کے تعبد کی زنجیریں، یہ بوجھل رکاوٹیں تھیں جنہوں نے یہودی اور عیسائیوں کے دل و دماغ مقید

کر دیئے تھے۔ پیغمبر اسلامؐ کی دعوت نے ان سب سے نجات دلائی۔ اس نے سچائی کی ایسی سہل اور آسان راہ دِکھا دی۔ جس میں عقل کے لیے کوئی بوجھ نہیں، عمل کے لیے کوئی سختی نہیں... افسوس! جن پھندوں سے قرآن نے اہلِ کتاب کو نجات دلائی تھی۔ مسلمانوں نے وہی پھر اپنے گلوں میں ڈال لیے۔''[۲۲] ہماری اجتماعی زندگی کے فساد (Corruption) نے بتا دیا ہے کہ ہم اپنے طرزِ زندگی کو سنوارے بغیر اپنے اخلاقی بحران پر قابو نہیں پا سکتے۔ اسی طرزِ زندگی کو بیان فرماتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میرے پروردگار نے مجھے حکم دیا ہے:

۱۔ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مخلص رہوں۔
۲۔ غصے اور مسرت میں انصاف کروں۔
۳۔ غربت ہو یا آسودگی، میانہ روی سے کام لوں۔
۴۔ جس نے میرے ساتھ زیادتی کی، اسے معاف کر دوں۔
۵۔ جس نے مجھے (میرے حق) سے محروم کیا، اسے نوازوں۔
۶۔ جس نے مجھ سے قطع تعلق کیا، اس سے رشتہ جوڑوں۔
۷۔ میرا سکوت سوچ ہو، میرا بولنا ذکرِ (خدا) ہو اور میری نظر عبرت کا سروساماں ہو۔[۲۳]

غرضیکہ انسان کو صحیح معنی میں انسان بنانا، رسول کریمؐ کی دعوت کا بنیادی مقصد ہے۔ اسلام چوں کہ زندگی کی نفی نہیں، بلکہ اثبات کا قائل ہے۔ اس لیے وہ زندگی کے ہنگاموں، شورشوں اور بدعنوانیوں سے نپٹنے کے لیے ایک اخلاقی ضابطہ رکھتا ہے۔ افسوس! آج مسلمان بہ وجوہ اخلاقی سطح پر منظم نہ ہو سکے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ 'وہ (عرب) شاندار عسکری فتوحات (کے باوجود) کپل (Capil) اور شنکر اچاریہ (Shankar Acharya) جیسی شخصیتیں نہ پیدا کر سکے۔'[۲۴] عجیب بات یہ ہے کہ البرٹ شویٹزر نے بھی یہی بات کہی ہے کہ ''اسلام کو اپنے وسیع پھیلاؤ کے لحاظ سے عالمی مذہب کہا جا سکتا ہے۔ لیکن روحانی طور پر وہ عالمی سطح پر ارتقا نہ کر سکا۔ وہ دنیا اور انسانیت کے لیے کسی ایسی عالمی فکر کی تخلیق نہیں کر سکا۔ (جو زندگی کی) گہرائیوں تک

سرایت کر سکے۔ اگر کبھی اس قسم کی فکر نے حرکت کی تو اسے دبا دیا گیا تا کہ قدامت پسندانہ افکار کی بالادستی کو برقرار رکھا جا سکے۔ بہرحال آج کا اسلام اپنی ظاہری سطح کے برعکس جو ایک آدمی کو ایک خاص خیال کی طرف لے جاتی ہے، اپنے اندر تصوف اور اخلاقی گہرائی کے زیادہ جاندار رجحانات رکھتا ہے۔''(۲۵) آج اسلام اور قرآن کے فلسفۂ اخلاقیات کو کسی سلیقے قرینے سے پیش نہ کرنے کی وجہ سے ہمارا ہی نہیں بلکہ پوری انسانی سوسائٹی کا نقصان ہوا ہے۔

آج ہماری سوسائٹی میں زندگی کے تمام شعبوں میں ایک آدمی کو جن مشکلات اور رسوائیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس سے ہر کوئی نہ صرف واقف ہے بلکہ دکھی اور بیزار بھی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہماری زندگی قرآن کے فلسفۂ اخلاقیات کا گہرا شعور نہیں رکھتی، سچائی کے اسی شعور کے ساتھ زندہ رہنے کا نام قرآن کی بولی میں تقویٰ ہے، جس کا صحیح ترجمہ خدا سرشاری اور انسان دوستی ہے۔ چنانچہ آج ہمارے بچے صحیح تعلیم و تربیت سے محروم ہیں اور ایک اخلاقی اور سول سوسائٹی کے تصور سے ناآشنا۔ اگر ہم ایشیائی ملکوں مثلاً چین یا جاپان ہی کے نظامِ تعلیم و تربیت کا مطالعہ کر لیتے کہ وہاں Room for Moral Education میں بچوں کو ان کے کلاسیکی تصورات کو جدید انداز میں کیسے پڑھایا جاتا ہے، اس سلسلہ میں کیا کیا تجربات کیے جا رہے ہیں اور بچے کو چوری سے بچنے، سچ بولنے اور ساتھی کی امداد کرنے کے لیے کن کن تجربات سے گزرنا پڑتا ہے، یعنی بچوں کو اخلاقی تعلیم فکری سطح پر نہیں بلکہ عملی سطح پر دی جاتی ہے اور انہیں اخلاقی قدروں کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے تجربات کیے جاتے ہیں۔ یہ وہی بات ہے جسے بڑے بڑے صوفی پیشہ ور مذہبی لوگوں سے کہا کرتے تھے: ''تم نے مردہ علم مردہ لوگوں سے سیکھا ہے۔ ہم نے زندہ علم زندہ لوگوں سے حاصل کیا ہے۔''

غرضیکہ اگر ہم ان تجربات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے فلسفۂ تعلیم و تربیت کو کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جدید منہج پر پڑھاتے تو آج ہم اپنی سوسائٹی کی اخلاقی قدروں کا ماتم نہ کرتے۔

اخلاقی بحران کے بعد ہمارا دوسرا مسئلہ پاکستان میں بڑھتی ہوئی بے ہنگم آبادی کا ہے

جس سے قومی زندگی اور معیشت بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ اس مسئلے پر ہم نے بار بار لکھا ہے۔ ہماری روایات میں آیا ہے کہ مصر میں پہلے مسلم عرب گورنر جناب عمرو بن العاص نے نمازِ جمعہ میں تقریر کرتے ہوئے لوگوں سے اپیل کی۔ ''تم چار چیزوں سے بچو: بیہودہ گفتگو (کثرۃ القیل و القال)، فضول خرچی (ضیاع المال)، کثرتِ اولاد (کثرۃ العیال)، پست معیارِ زندگی (انخفاض الحال)۔ اس تقریر سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے اسلاف کس حد تک اپنی عملی زندگی میں حقیقت پسند اور بالغ نظر واقع ہوئے تھے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے قرآن مجید اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے روشنی لے کر تاریخ میں ایک تخلیقی کردار ادا کیا۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ صدیوں پہلے مصر کے نامور قومی کمانڈر (عمر بن العاصؓ) نے جو کچھ کہا تھا، آج اس کی تصدیق عہدِ حاضر کے ایک مفکر ول ڈیورانٹ (Will Durant) نے کر دی ہے۔ ڈیورانٹ لکھتا ہے:

''یہ بھیڑ نہیں، بلکہ ذہن اور ہنرمندی ہے جو میدان جیتتے ہیں۔''(☆)

یہاں ہم نے رسولِ کریمؐ کی سیرتِ طیبہ کے حوالے سے اپنی اجتماعی زندگی کے چند الجھے ہوئے مسائل کا ذکر کیا ہے۔ اگر ہم اخلاص سے معرکہ ہائے حیات میں رسولِ کریم ﷺ کے نقشِ پا کو اپنا لیں اور علم و عقل اور انسانی تجربہ و مشاہدہ کی روشنی میں اپنے مسائل کا حل تلاش کریں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی ژولیدگیٔ فکر اور عملی کوتاہیوں پر قابو نہ پا سکیں۔ بے شبہ منزل کا سراغ پانے کے لیے ہمیں ایک بلند نصب العین سے سرشار ہو کر خدائی راہ پر چلنا ہوگا۔ اقبال نے سچ کہا تھا کہ زندگی برسوں کعبہ و بت خانہ میں نالہ و بکا کرتی ہے تب کہیں 'بزمِ عشق' سے کوئی 'دانائے راز' اُٹھتا ہے، آج پاکستانی سوسائٹی اسی دانائے راز کی تلاش میں ہے۔

(☆) "Quantity never won a battle, it is brains and tools that win." (*The Story of Philosophy*, by: Will Durant)

حواشی:

(۱) ابنِ ہشام: السیرۃ النبویۃ، ج۱، (قاہرہ ۱۹۵۵ء)، ص ۲۲۳-۲۲۵ (مصطفی السقا ایڈیشن)۔

(۲) محمد الخضری: نور الیقین فی سیرۃ سیّد المرسلین، (دمشق ۱۹۸۴ء)، ص ۲۲ (تحقیق شیخ نایف العباس)۔

(3) A.J. Arberry, *The Holy Kuran, An Introduction* (London, 1953), P.30

(۴) محمد الخضری: نور الیقین، ص ۴۷۔

(۵) ان دونوں مقامات پر قرآن نے فرمایا کہ جو لوگ صبح شام اللہ کے ذکر سے سرشار ہیں، ان کی صحبت کو چھوڑ کر آپ ان لوگوں سے کوئی تعلق نہ رکھیں، جن کے دل خدا کی یاد سے غافل ہیں اور اپنی خواہشوں کے غلام۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: قرطبی: احکام القرآن، (سورۃ الانعام اور سورۃ الکہف)۔

(۶) سیرۃ ابنِ ہشام، ج۱، ص ۲۹۶-۲۹۷۔

(۷) **الخلق عیال الله، أحبّهم ابرّهم لعیاله. (مشکاة المصابیح، کتاب الحبّ فی الله).**

(۸) **اللهم اشهد أن العباد کلهم اخوه.**

(۹) ترجمان القرآن (ج۱، ص ۱۷۹، ساہتیہ ایڈیشن، دہلی) میں ابوالکلام آزاد نے بڑے مؤثر انداز میں لکھا ہے۔

(۱۰) القرطبی: احکام القرآن، ج ۸، ص ۱۷۴ (تفسیر سورۃ التوبہ: ۶۰)، ط: دار الکتب المصریہ۔

(۱۱) ابنِ حزم: المحلی، ج ۳، (قاہرہ)، ص ۴۵۵، **لو استقبلتُ ما استدبرت من امری لاخذت فضول اموال الاغنیاء وقسمتها علی الفقراء.**

(۱۲) حضرت عمرؓ نے فرمایا: اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو دوسری منزل کو جو دوسرے مکانوں سے نمایاں ہے، ڈھا دوں گا۔ تاکہ وحدت کا اظہار ہو۔

A. Banisadr, *Islamic Government*, Translated by Muhammad Ghairoon Parar, (Lexington, U.S.A., 1981), p.82

(۱۳) اس نصف صدی میں مرحوم مسعود کھدر پوش کی ہاری رپورٹ اور ممتاز دولتانہ رپورٹ ۴۹-۱۹۴۸ء میں چھپیں۔ ۱۹۵۸ء میں مرحوم محمد ایوب خان اور ۱۹۷۳ء میں بھٹو حکومت نے جاگیرداری کو ختم کرنے کے لیے ابتدائی اصلاحات جاری کیں، لیکن وہ مطلوبہ نتائج حاصل نہ کر سکیں۔ حتیٰ کہ ۱۹۷۷ء کی فوجی حکومت اور اس کی قائم کردہ وفاقی شرعی عدالت نے ان 'زرعی اصلاحات' کو بھی غیر اسلامی قرار دے دیا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: روزنامہ ڈان، لاہور، ۱۳/ اگست ۲۰۰۱ء، ص ۷، ایئر مارشل اصغر خان:

The King's Party) اس موضوع پر مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے ۱۹۳۸ء میں 'اسلام کا اقتصادی نظام'؛ سیّد مناظر احسن گیلانی نے 'اسلام اور جاگیرداری نظام'؛ مولانا محمد طاسین نے 'اسلام اور مروجہ نظامِ زمینداری' کے خلاف لکھا۔ یاد رہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن کی کتاب پر مرحوم مولانا مودودیؒ نے ''ترجمان القرآن''، جنوری ۱۹۴۱ء، ص ۱۴۱-۱۴۵ میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا: (یہ کتاب) ''اشتراکیوں'' کو خوش کرنے کی ایک تبلیغی کوشش ہے۔'' تاریخ کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ جب ۱۹۷۰ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی عوامی تحریک اُٹھی اور سوشلزم کا نعرہ بلند ہوا، تو مولانا مرحوم نے ۱۹۷۱ء میں اپنے انتخابی منشور میں تحدیدِ ملکیت کو تسلیم کر لیا۔

تاریخ کا یہ تماشہ بھی دیکھئے کہ زمینداری کا یہ ظالمانہ نظام اس سرزمین میں روا رکھا گیا، جو اسلام کو اپنا دستورِ حیات تسلیم کرتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کے پاس زمین ہو، اسے چاہیے کہ وہ خود اسے کاشت کرے یا اپنے بھائی کو (کاشت کے لیے) دے دے۔''(☆) یہاں اس بات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اقبال نے بندۂ مزدور کی حمایت میں جس اچھوتے انداز سے لکھا ہے، اس سے بہتر شاید ہی کسی نے بندۂ مزدور کے تلخ اوقات پر لکھا ہو۔ فرماتے ہیں:

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
(بالِ جبریل: لینن کے خدا کے حضور میں)

اقبال کی وفات سے پہلے جواہر لال نہرو لاہور میں علامہ کی خواہش پر اُن سے ملے تھے۔ اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے اُنھوں نے اپنی کتاب ''تلاشِ ہند'' (Discovery of India) میں لکھا تھا: ''زندگی کے آخری برسوں میں اقبال سوشلزم سے بہت قریب آ گئے تھے۔''

(۱۴) محمد الخضری: نور الیقین، ص ۷۵، ابنِ ہشام نے چند جملے اور بھی لکھے ہیں۔ دیکھئے: سیرۃ ابنِ ہشام، ج I، ص ۴۲۰۔

(15) Sir R. Livingstone, *Plato Selections*, London, 1996, p.29.

(16) "The self control which Mohammad revealed at Hudaibiyya, his

(☆) یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی متفقہ روایت ہے۔ ملاحظہ ہو: **اللؤلو والمرجان، فیما اتفق علیه الشیخان**، قاہرہ، ج ۲/۱۶۱

ability to bear occasional humiliation in unimportant issues, in order to achieve an exalted goal, shows that he was a person of unique ability. A man of his mental superiority always keeps the rein in his hands, even when he is forced to yield to the moment and the time soon came, when he was able to reap the fruits of the wisdom which he displayed at Hudaibiyya." [*Mohammad, the Man and His Faith* (London, 1956), p. 163].

ادھر کئی سال پہلے ۱۹۷۶ء میں مرحوم ڈاکٹر اسماعیل راجی فاروقی نے محمد حسین ہیکل کی عربی کتاب 'حیاتِ محمدؐ' کا انگریزی زبان میں ترجمہ امریکہ سے شائع کیا تھا۔ مذاکرات میں اہلِ مکہ کے جارحانہ اور اشتعال انگیز روّیہ کے جواب میں آنحضرتؐ نے جس پیغمبرانہ وقار اور صبر و تحمل کا مظاہرہ فرمایا، اس سے ہمارے دانشور اور سفارت کار روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔

(۱۷) احمد تیمور باشا: محمد رسول اللہ ﷺ (قاہرہ، ۱۹۶۶ء)، ص ۷۵۔

(۱۸) شرح ابن الحدید علی نہج البلاغہ، ج ۴، ص ۲۹۹، بحوالہ محمد رسول اللہؐ از احمد تیمور باشا، ص ۱۴۹۔

(۱۹) الازرقی؛ ابوالولید محمد بن عبداللہ: اخبار مکہ المشرقہ، ج ۱، (بیروت ۱۹۶۴ء)، ص ۱۱۳۔ (ان النبی صلعم دخل الکعبہ یوم الفتح وفیھا صور الملائکہ وغیرھا... ثم رأی صورۃ مریم فوضع یدہ علیھا وقال امحوا مافیھا من الصور الا صورۃ مریم) نیز دیکھئے ص ۱۱۲ (روایتِ شیبہ)۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مدائن میں ایوانِ کسریٰ میں بھی فنی تصویروں کو باقی رکھا گیا۔ محمد حسین ہیکل 'عمر الفاروق' میں لکھتے ہیں: 'مفتوح ملکوں میں مسلمانوں نے فن (و ادب) کے بعض آثار دیکھے، جو ان اصنام سے ملتے جلتے تھے، جو ایامِ جاہلیت میں کعبہ میں تھے، مسلمانوں نے انہیں تلف نہیں کیا۔ بلکہ (حضرت) سعد بن ابی وقاص نے اس بات میں بھی کوئی قباحت محسوس نہیں کہ مدائن میں ایوانِ کسریٰ کو جائے صلوٰۃ قرار دیا اور ان تصویروں کو بھی باقی رکھا جو قصر کی زینت و رونق کو بڑھانے کے لیے بنائی گئی تھیں۔' (ج ۲، ص ۲۵۸، قاہرہ ۱۹۴۵ء) نیز دیکھئے: سر تھامس آرنلڈ (T.W. Arnold) کی معروف کتاب: 'اسلام میں مصوری' (*Painting in Islam*، New York، 1965)۔

(۲۰) محمد فواد عبدالباقی: اللؤلؤ والمرجان فیما اتفق علیہ الشیخان (قاہرہ ۱۹۷۹ء)، ج ۲، ص ۸۰۔ آپ نے فرمایا: لولا حداثۃ قومک بالکفر لنقضتُ البیت ثم لبنیتہ علی اساس ابراھیم علیہ السلام... (روایت حضرت عائشہؓ)۔

(۲۱) اس مسئلے پر تفصیل کے لیے دیکھیے: المعارف، لاہور، (جولائی-دسمبر ۱۹۹۸ء)، ص ۷۷-۱۲۰۔

(۲۲) ابوالکلام آزاد: ترجمان القرآن، ج ۲، سورۃ الاعراف: ۱۵۷۔

(۲۳) العقد الفرید، ج ۲، ص ۲۱۷ (قاہرہ ۱۹۷۰ء)

"أوصانی رَبّی بتسع و أنا أوصیکم بها؛ أوصانی بالإخلاص فی السّر و العلانیه؛ والعدل فی الرضا و الغضب؛ والقصد فی الغنی والفقر؛ أن أعفو لمن ظلمنی و أعطی من حرمنی؛ و اصل من قطعنی؛ و ان یکون صمتی فکراً؛ ونطقی ذکراً و نظری عبراً."

(۲۴) مظفر حسین برنی: اقبال، چندی گڑھ (بھارت)، ۱۹۸۵ء، ص ۷۱، ۷۲۔ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ تقریباً یہی بات ابوسلیمان منطقی نے صوان الحکمۃ میں لکھی ہے کہ ان سے ایک رات سیستان کے بادشاہ ابوجعفر نے کہا: 'ہمارے اہلِ فلسفہ میں سے کوئی سقراط، افلاطون اور ارسطو نہ اُٹھا۔' 'اجتمعنا لیلةً عندالملک ابی جعفر... فقال الملک: 'ما وجدنا فیهم... من یقوم فی انفسنا مقام سقراط او افلاطون او ارسطوطالیس'. (طہران ۱۹۷۴ء، ص ۲۹۹، عبدالرحمٰن بدوی ایڈیشن)۔

(25) Albert Schweitzer, *My life and Thought*, (London, 1966), p.151.